برسوں بعد

بیٹھے بیٹھے آج کسی کی یاد نے یوں انگڑائی لی
اشکوں کا بے موسم بادل ٹوٹ کے برسا برسوں بعد

سیّد انصر

برسوں بعد

سیّد انصر

انتساب

محسنِ انسانیت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم

کے نام

برائے رابطہ

سیّد انصر Syed Anser

Anser Pharmacy Near Karim Center
Railway Line Sarai Alamgir. (Gujrat)
Pakistan.

00 92 300 95 15 623
00 92 544 651 350
e-mail: sansershah@gmail.com
fb: Syed Anser

تُو ہے محیطِ بیکراں، میں ہوں ذرا سی آبجو
یا مجھے ہمکنار کر یا مجھے بے کنار کر

اک اضطرابِ مسلسل، غیاب ہو کہ حضور
میں خود کہوں تو مری داستاں دراز نہیں

اقبالؔ

فہرست

سید انصر کی بنیادی شعری واردات کے علاقے مکہ و مدینہ، بدر و حنین اور نجف و کربلا تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اپنے لہو میں رچے ہوئے انہی سلسلوں سے وہ عصری سچائیاں تلاشتا، نیک و بد شناختا اور انسان دوستی کی برتر جہات میں جینے کا جتن کرتا ہے۔ اسی پس منظر میں وطن عزیز پاکستان اس کے لیے زمین و جغرافیے سے اوپر اٹھ کر اپنے فکری و تہذیبی بہاؤ کی زندہ و متحرک علامت بن جاتا ہے۔

خیال و فن کے جمالیاتی اتار چڑھاؤ سے قطع نظر طبعی جوہر کی بہترین کارفرمائی کی سطح پر اس کا شعری اظہار روایت کے تخلیقی تسلسل سے خوبصورت رشتہ استوار کرتا ہے۔ اس عمل میں بہت سے مقامات پر اس کی انفرادیت کے نقوش توجہ کھینچتے اور خوشگوار تاثر ابھارتے ہیں۔ شاہراہِ غزل پر رواں بھیڑ میں پہچان کا یہ سفر برابر آگے بڑھ رہا ہے۔

جلیل عالی

۱۲ فروری ۲۰۰۶ء

میں صرف اپنے قبیلے کی خیر کیوں مانگوں
کہ ایک جیسے ہیں انساں جہان بھر کے مجھے

سیّد انؔصر

حمد، نعت، سلام

حمد

مالکِ کُل
خداوندِ عالم
ایک انسان سے تیری توصیف ممکن نہیں
صاحبِ کن !
ترے حُسنِ تخلیق کا کیا احاطہ کروں
میں تنگ چشم ، کج فہم ، بے مایہ سا پیکرِ خاک ہوں
ایک گہرے اندھیرے میں لپٹا ہوا
اور تُو سب جہانوں میں پھیلا ہوا

کُو بہ کُو، سُو بہ سُو، روشنی کی طرح
زندگی کی طرح

مالکِ کُل
خداوندِ عالم
اورائے صاحبِ کن فکاں
تُو کہاں
میں کہاں

نعت

کیوں مجھ کو ستائیں گی زمانے کی بلائیں
اللہ مرے دائیں ہے محمد ﷺ مرے بائیں

میں دیپ جلاتا تو مچلتی تھی ہوائیں
وہ دے گئے آ کر رُخِ انور کی ضیائیں

کس منہ سے کروں گا میں شفاعت کی گذارش
پوشیدہ رکھے ان سے خدا میری خطائیں

خالی کوئی منکر ہی پلٹتا ہے وہاں سے
عُشاق پہ ہوتی ہیں عطائیں ہی عطائیں

موقوف نہیں اہلِ زمیں پر ہی ترا ذکر
آتی ہیں فلک سے بھی درُودوں کی صدائیں

ہم اُن کے ثنا خواں ہیں شہنشاہِ زماں ہیں
گو تاج نہیں سر پہ دریدہ ہیں قبائیں

بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں طوفاں کے تھپیڑے
لِلّٰہ اس اُمت کے سفینے کو بچائیں

چہرہ ہے کہ اک نور، جو دیکھا نہ سنا ہو
زلفیں ہیں کہ چھائی ہوئی رحمت کی گھٹائیں

انؔصر چلو دیکھیں کہ بزرگوں سے سنا ہے
جنت سے حسیں تر ہیں مدینے کی فضائیں

سلام

یہ سر، یہ نوکِ سناں پر کلام، لاکھوں سلام
سلام، اہلِ وفا کے امام، لاکھوں سلام

ترے گلو سے ٹپکتے ہوئے لہو نے دیا
چراغِ صدق کی لو کو دوام، لاکھوں سلام

یہ آب جُو نہیں، دونوں جہان تیرے ہیں
لبِ فرات کھڑے تشنہ کام، لاکھوں سلام

قدم قدم پہ ہواؤں کو شرمسار کیا
نبی ﷺ کے گھر چراغو سلام، لاکھوں سلام

تری طرح نہ کسی سے ادا ہوئی ہے نماز
وقارِ سجدہ و جانِ قیام، لاکھوں سلام

اِدھر بھی ایک نظر اے سوارِ نوکِ سناں
کہ پیش کرتا ہے خورشیدِ شام، لاکھوں سلام

ترے یقین کے فیضان سے زمانے میں
ہوئی ہے دولتِ ایمان عام، لاکھوں سلام

چلا ہوں روضۂ شبیر کی طرف، انصؔر
زباں سے پڑھتے ہوئے گام گام، لاکھوں سلام

غزلیات

❀

نہیں کہ راہِ وفا میں ٹھہر گیا ہوں میں
پلٹ کے دیکھ ترے ساتھ چل رہا ہوں میں

تو اب کسی سے نہ ٹوٹے گا خامشی کا فسوں؟
دیارِ سنگ میں کیا آخری صدا ہوں میں؟

وہ مجھ کو چُھو تو گیا اپنی جلتی پوروں سے
اسے خبر بھی نہیں راکھ ہو گیا ہوں میں

گزرنے والے ذرا احتیاط سے چلنا
مثالِ سنگ تری راہ میں پڑا ہوں میں

میں خود کو ڈھونڈتا رہتا ہوں اُس کی آنکھوں میں
وہ اس گمان میں ہے اُس کو دیکھتا ہوں میں

بلا ارادہ مسافت کا بوجھ اٹھائے ہوئے
ابھی ابھی تری جنت سے آ رہا ہوں میں

خیالِ عہدِ گزشتہ رہائی دے مجھ کو
وہاں نہ کھینچ، جہاں سے گزر چکا ہوں میں

یقین صدقِ محبت کے باوجود انؔصر
اُسے گِلہ ہے کہ تھوڑا سا بے وفا ہوں میں

❀

تیرے پیکر کی جو مورت سی بنی ہے دل پر
اک قیامت ہے کہ بس ٹوٹ پڑی ہے دل پر

یونہی دستورِ زمانہ کا بھرم رکھنے کو
ہم نے یہ عشق کی تہمت سی دھری ہے دل پر

شوقِ تجدیدِ ملاقات بجا ہے لیکن
کیا علاج اُس کا کہ جو دھول جمی ہے دل پر

اس قدر سہل نہ تھا فیصلۂ ترکِ وفا
بڑی مشکل سے یہ دیوار چُنی ہے دل پر

دیکھ اے حادثۂ نَو، ذرا تھم تھم کے گزر
یادِ ایام ابھی سوئی ہوئی ہے دل پر

پھر کسی جلتی ہوئی آس نے دم توڑا ہے
کھولتے خون کی اک بوند گری ہے دل پر

گاہ ہنستے ہیں گہے ٹوٹ کے رو پڑتے ہیں
کچھ دنوں سے عجب اُفتادہ پڑی ہے دل پر

آج اک عمر کی بھولی ہوئی صورت انصؔر
یاد آئی ہے تو بجلی سی گری ہے دل پر

❀

صدیاں گزر گئیں ہمیں پیا سے مَرے ہوئے
کس کام کے ہیں تیرے سمندر بھرے ہوئے

گزرا ہے کون دام بکف صحنِ باغ سے
شاخوں میں چھپ گئے ہیں پرندے ڈرے ہوئے

کرنوں کی رَتھ پہ بیٹھ کے آئے گا آفتاب
اور جی اٹھیں گے کتنے ہی سائے مَرے ہوئے

دیکھا یہ سانحہ بھی دلِ نامراد نے
جب آنکھیں خشک ہو گئیں، سپنے ہرے ہوئے

اس عہدِ بے وقار میں کچھ اہلِ فقر بھی
زندہ ہیں سیم و زر کی چمک پر مَرے ہوئے

❁

ملنے والے تو بچھڑ جاتے ہیں
شہر کیوں پَل میں اجڑ جاتے ہیں

ہائے وہ لوگ کہ جاتے جاتے
رتجگے آنکھوں میں جڑ جاتے ہیں

سہم جاتے ہیں درختوں کے جسم
پات جب شاخوں سے جھڑ جاتے ہیں

ہاتھ زنجیر سے بندھتے ہیں، کبھی
پا سلاسل میں جکڑ جاتے ہیں

سر پہ آ جائے جو سورج انؔصر
پھر تو سائے بھی سُکڑ جاتے ہیں

❀

اک زہر رگِ جان تلک آیا ہوا ہے
دل نے مجھے کس سانپ سے ڈسوایا ہوا ہے

ڈھونڈے ہے جسے وسعتِ افلاک میں دنیا
وہ راز مرے سینے میں دفنایا ہوا ہے

دیکھوں ترے پیکر کو تو دیکھے چلا جاؤں
یہ آئینہ آنکھوں کو بہت بھایا ہوا ہے

شبنم نے نئی صبح کے اعلان کی خاطر
ہر ذرے کو اک آئینہ پہنایا ہوا ہے

ہر ریشۂ تن مدفنِ امید ہے انؔصر
اک شہر مری خاک میں دفنایا ہوا ہے

❀

جب کوئی بات ضروری سی نکل آتی ہے
پاس ہوتے ہوئے دُوری سی نکل آتی ہے

دل کے سوئے ہوئے زخموں کو کریدوں جس دم
کوئی تصویر ادھوری سی نکل آتی ہے

آپ سے ملتے ہوئے خود سے بچھڑ جاتا ہوں
خاکساری سے غروری سی نکل آتی ہے

ہم جسے سوچتے ہیں سامنے پا لیتے ہیں
اب تو دُوری سے حضوری سی نکل آتی ہے

یہ بھی کیا کم ہے کہ اس یارِ کم آمیز کے ساتھ
اک ملاقات ادھوری سی نکل آتی ہے

❀

پھر دل کے دھڑکنے سے مری جاں پہ بنی ہے
سینے میں بپا عالمِ زنجیر زنی ہے

اے غم زَدَگاں! دل کی پناہوں میں چلے آؤ
نازک ہی سہی پیڑ مگر چھاؤں گنی ہے

بے جنبشِ لب کہہ بھی دیا حالِ طبیعت
یہ کیسی خموشی ہے، یہ کیا ہم سخنی ہے

دیکھو تو ہر اک شخص ہے آلام سے آزاد
سوچو تو ہر اک سر پہ یہ تلوار تنی ہے

پھل کیا کوئی پتا بھی نہیں پیڑوں کے تن پر
گلشن میں عجب موسمِ بے پیرہنی ہے

ہر شعبدہ گر خلعت و دستار کا حقدار
ہر مدعیٔ حق یہاں گردن زَدَنی ہے

اے تشنہ لبی کونسی شے چاہیئے تجھ کو
یہ ساحلِ دریا ہے یہ نیزے کی اَنی ہے

ہر نوکِ قلم تیشۂ فرہاد ہے انصؔر
یہ کارِ سخن سلسلۂ کوہ کنی ہے

❀

شمع کی لَو میں یار جلتا تھا
میں بھی پروانہ وار جلتا تھا

پانی پانی کی آ رہی تھی صدا
کوئی دریا کے پار جلتا تھا

میں تو جلتا تھا آئینے پیچھے
آئینہ پیشِ یار جلتا تھا

میرے عزمِ سفر کی گرمی سے
راستوں کا غبار جلتا تھا

تِل سلگتا تھا سرخ لب کے قریب
گُل کے شعلے سے خار جلتا تھا

وہ اُدھر ترکِ عشق پر نادم
میں اِدھر سوگوار جلتا تھا

❀

اَبَد کِنار اُجالوں سے ہیں بھرے ہوئے ہم
ہوا کے رحم و کرم پر نہیں دھرے ہوئے ہم

سناں پہ سج کے بھی سچائی کی گواہی دی
ہزار زندوں پہ بھاری رہے مَرے ہوئے ہم

ہجومِ رنگ پہ شعلہ زنی کا شائبہ تھا
گلاب چُھو نہ سکے آگ سے ڈرے ہوئے ہم

بدن نچوڑ کے پلکوں پہ نُور لایا گیا
جڑوں کو کھا گئی دیمک ہرے بھرے ہوئے ہم

زمیں نے کھینچ لیا اَوس کی طرح انصؔر
لرز رہے تھے کسی پات پر دھرے ہوئے ہم

❀

ہم سا کسے نصیب غمِ دوستاں کا بوجھ
رکھا ہوا ہے سینے پہ ہفت آسماں کا بوجھ

میں ریزہ ریزہ ہو گیا راہِ حیات میں
سر سے اُتارتے ہوئے عمرِ رواں کا بوجھ

جب کارِ زندگی سے سبک دوش ہو گئے
پھر کیسا رنج، کیسی اداسی، کہاں کا بوجھ

پھر یوں ہوا کہ عدل کا پِندار بھی گیا
منصف کا سر جھکا گیا میرے بیاں کا بوجھ

انؔصر کھڑے ہیں کب سے سرِ کوئے یار ہم
دل پر لیے ہوئے نگہِ دشمناں کا بوجھ

❀

سُن دیدۂ اشک بار میرے
ایسے تو نہیں تھے یار میرے

محلوں سے نکل کے کون دیکھے
یہ اجڑے ہوئے دیار میرے

دیوارِ حیات راستہ دے
کچھ یار کھڑے ہیں پار میرے

یا تھام لے گردشِ زمانہ
یا شام و سحر گذار میرے

اس خوف سے جاگتا ہوں شب بھر
سو جائیں نہ پہریدار میرے

آ کرۂ خاک پر قدم رکھ
کچھ تُو بھی چکا اُدھار میرے

نزدیک رہو کہ دُور جاؤ
ٹوٹیں گے نہیں حصار میرے

اے موجِ ہوائے شہرِ دلبر!
جی بھر کے اڑا غبار میرے

گو محفلِ دوستاں ہے انؔصر
دشمن بھی ہیں یاں دو چار میرے

❀

ہم سے کسی کے بخت کا تارا نہیں ملا
بچھڑا جو ایک بار دوبارہ نہیں ملا

کاغذ کی کشتیوں میں سواری کا شوق تھا
اب یہ شکایتیں ہیں کنارہ نہیں ملا

خوشبو بھی سو رہی ہے ابھی پتیوں کے بیچ
غنچوں کو بھی ہوا کا اشارہ نہیں ملا

ہنس ہنس کے طے کئے ہیں جدائی کے راستے
اس کاروبار میں بھی خسارہ نہیں ملا

چاہا نہیں کسی کو کبھی آپ کی طرح
دنیا میں کوئی آپ سا پیارا نہیں ملا

چپ چپ اداس اداس ہیں پتوں کی پائلیں
شاخوں کو ناچنے کا اشارہ نہیں ملا

جاناں! یہیں کہیں انہی لمحوں کی بھیڑ میں
اک خواب کھو گیا تھا ہمارا نہیں ملا

انؔصر ہمارے وہم و گماں میں نہ تھا کہ تم
یہ کہہ کے چھوڑ دو گے سہارا نہیں ملا

❀

مری تلاش میں یارا زمانہ آئے گا
اکیلا تُو نہیں سارا زمانہ آئے گا

ترے جہان سے جاتے ہیں اس یقین کے ساتھ
ہمارے بعد ہمارا زمانہ آئے گا

تُو کاروبارِ محبت سے باز مت آنا
تجھے دکھانے خسارہ زمانہ آئے گا

وہ اپنے حسن کے بل پر قیاس کر بیٹھا
کہ اس نے جب بھی پکارا زمانہ آئے گا

گھری ہے ناؤ بھنور میں کوئی نہیں آیا
کبھی ملا جو کنارہ زمانہ آئے گا

یہ اور بات خبر تک نہ لی کسی نے کبھی
جو مر چکیں گے تو سارا زمانہ آئے گا

❀

اسے گنوا کے جو ہم کھوئے کھوئے بیٹھے ہیں
یونہی ذرا سا مقدر پہ روئے بیٹھے ہیں

ہمیں پتا ہے کہ یہ زندگی پرائی ہے
سو اس خزانے سے ہم ہاتھ دھوئے بیٹھے ہیں

کیا ہے عشق تو رسوائیوں سے کیا ڈرنا
کہ کاٹنا تو وہی ہے جو بوئے بیٹھے ہیں

فراقِ یار کی الجھن کوئی نئی تو نہیں
یہ ایک بوجھ کئی بار ڈھوئے بیٹھے ہیں

رئیسِ شہر تو غفلت شعار تھا سو تھا
فقیہ و شیخ بھی منبر پہ سوئے بیٹھے ہیں

کبھی قریب تو آ، حال پوچھ، چُھو کر دیکھ
جنہیں تو زندہ سمجھتا ہے مَوئے بیٹھے ہیں

وہ خاک سمجھیں گے لہروں کے پیچ و خم انصؔر
جو ساحلوں پہ سفینے ڈبوئے بیٹھے ہیں

❀

زمانے سے نہاں رکھنا تھا، رکھا
تمہارا غم جہاں رکھنا تھا، رکھا

خوشی ہو، غم ہو، دل ہو یا نظر ہو
جسے بھی پرفشاں رکھنا تھا، رکھا

اگرچہ سینکڑوں سے دوستی کی
مگر جس کو جہاں رکھنا تھا، رکھا

محبت بانٹنے کی شے تھی، بانٹی
کہ یہ دریا رواں رکھنا تھا، رکھا

نہ کی تقلیدِ ہم عصراں غزل میں
جدا رنگِ بیاں رکھنا تھا، رکھا

رہِ تنہائی میں بھی اپنے ہمراہ
ہجومِ ہمرہاں رکھنا تھا، رکھا

❀

جیون راہ پہ چلتے چلتے مڑ کر دیکھا برسوں بعد
کیا کھویا، کیا پایا ہم نے، آج یہ جانا برسوں بعد

ایک ذرا سی دیر میں برسوں کی خاموشی ٹوٹ گئی
کس نے سمے کی جھیل میں پہلا پتھر پھینکا برسوں بعد

بیٹھے بیٹھے آج کسی کی یاد نے یوں انگڑائی لی
اشکوں کا بے موسم بادل ٹوٹ کے برسا برسوں بعد

مدت بعد ملے ہم دونوں تو ایسا محسوس ہوا
وقت نے اک تصویر کے دو ٹکڑوں کو جوڑا برسوں بعد

رات مرے کمرے میں کوئی سایا سا لہرایا تھا
نیند اڑی آنکھوں نے شاید سپنا دیکھا برسوں بعد

تعبیروں کے کھوج میں آخر اپنا آپ گنوا بیٹھے
انؔصر اپنا ہر اک سپنا جھوٹا نکلا برسوں بعد

❁

سُرمہ نے چشمِ ناز کو ایسا دلیر کر دیا
جس پہ نگاہ ڈال دی راکھ کا ڈھیر کر دیا

اس کی طرف سے صلح کی بات پہ غور کیا کروں
جس نے پیامِ جنگ بھی راہ میں گھیر کر دیا

ہم وہ فقیر لوگ ہیں موج میں آ گئے اگر
تخت کو لات مار دی بخت کو زیر کر دیا

مشعلِ بام کیا بجھی اشک سجا کے رکھ لیے
میں نے پلک پلک کو آج گھر کی منڈیر کر دیا

تیرگئی حیات میں عشق وہ آفتاب ہے
جس نے سیاہ رات کو اُجلی سویر کر دیا

❀

کل جسے گرنا ہے اُس دیوار کا سایہ ہوں میں
آج ہونی کا نشانہ دیکھ کر آیا ہوں میں

دھیان کی پرواز اُس کی انتہا چھو آئی ہے
آسماں سمجھا تھا شائد خاکِ بے مایہ ہوں میں

چھاؤں میں دیکھو تو ٹھنڈی سی کرن ہوں دھوپ کی
دھوپ میں دیکھو تو اک جلتا ہوا سایہ ہوں میں

سر جھکا کر اپنی یکتائی کا نظارہ نہ کر
آنکھ اٹھا کر دیکھ کتنی دور سے آیا ہوں میں

آج پہلی بار تجھ کو آزمایا زندگی!
زندگی میں آج پہلی بار پچھتایا ہوں میں

❁

یہ جو ملتے ہیں جھکا کر آنکھیں
لوٹ لیتے ہیں ملا کر آنکھیں

چوم لیتے ہیں ترے دھیان میں ہم
کورے کاغذ پہ بنا کر آنکھیں

چھین لے مجھ سے مری بینائی
یا اندھیروں سے رہا کر آنکھیں

اُس نے پلکوں سے چھوا پلکوں کو
میری آنکھوں پہ جھکا کر آنکھیں

شوقِ نظارہ لیے نکلے تھے
لوٹ آئے ہیں گنوا کر آنکھیں

اُس کی آنکھوں میں ہوئے ہم غرقاب
سب کی آنکھوں سے بچا کر آنکھیں

مجھ کو ڈر ہے کہ یہ غم کا سیلاب
لے ہی جائے نہ بہا کر آنکھیں

یا زباں کھول کے برسا کلیاں
یا گرا برق اٹھا کر آنکھیں

دھیرے دھیرے سے لہو رو انصؔر
چپکے چپکے سے فنا کر آنکھیں

دیکھ انصؔر یہ روش ٹھیک نہیں
ہر کسی کی نہ پڑھا کر آنکھیں

❀

ایک پل چین سے سویا بھی نہیں جا سکتا
کیا کریں ٹُوٹ کے رویا بھی نہیں جا سکتا

خواب اشکوں کی طرح آنکھ سے جھڑتے بھی نہیں
بوجھ ایسا ہے کہ ڈھویا بھی نہیں جا سکتا

ایسے موتی بھی کوئی موتی ہیں اے دیدۂ تر!
جن کو دھاگے میں پرویا بھی نہیں جا سکتا

عشق وہ داغ کہ لگتا نہیں ہر دامن پر
اور لگ جائے تو دھویا بھی نہیں جا سکتا

کیا قیامت ہے کہ ساحل بھی مقدر میں نہیں
اور سفینے کو ڈبویا بھی نہیں جا سکتا

ایک لمحہ جسے پانے میں زمانے بیتے
کھونا چاہا ہے تو کھویا بھی نہیں جا سکتا

آنکھ تَر تھی تو سمندر مری آغوش میں تھا
اب تو دامن کو بھگویا بھی نہیں جا سکتا

اشک جم جاتے ہیں پتھرائی ہوئی آنکھوں میں
غم زیادہ ہو تو رویا بھی نہیں جا سکتا

❀

فرقت میں جیئے جانے کے آثار سے کم ہیں
سو ہم کو اُمیدیں دلِ بیمار سے کم ہیں

میں اشک بہاتا نہیں پیتا ہوں سو احباب
آگاہ مرے دیدۂ خونبار سے کم ہیں

پندار کی بازی ہو تو دنیا کے خزانے
قیمت میں مرے طُرّہٗ دستار سے کم ہیں

اُس شہرِ تمازت میں رہائش ہے ہماری
سایوں کے مراسم جہاں اشجار سے کم ہیں

یا شہر کا ہر شخص گراں گوش ہے انؔصر
یا نالے مرے قامتِ دیوار سے کم ہیں

❀

آنے جانے والوں کا کیا آتے جاتے ہیں
ہم تو اپنی موج میں ہنستے گاتے جاتے ہیں

طوفانوں کی صورت پاؤں بڑھاتے جاتے ہیں
دریا، صحرا، پربت سے ٹکراتے جاتے ہیں

کیسا دور ہے، کیسے لوگ ہیں امن کا دھوکا دے کر
ہنستے بستے گھروں کو آگ لگاتے جاتے ہیں

دنیا والے ہم جیسے سادہ دل لوگوں کو
پھول دکھا کر زنجیریں پہناتے جاتے ہیں

یارانے کے نام پہ انؔصر اک مدت سے ہم
اپنے آپ کو سانپوں سے ڈسواتے جاتے ہیں

❀

بلندیوں سے نہ یوں دیکھ دھیان بھر کے مجھے
تری طلب ہُوں تو لے جا اُڑان بھر کے مجھے

یہ کون شخص مری ہی صفِ سپہ میں کھڑا
بنا رہا ہے نشانہ کمان بھر کے مجھے

میں اپنی شاخ سے جھڑ کر بھی معتبر ہی رہا
بُھلا نہ پائے مکیں گلستاں بھر کے مجھے

تمازتیں ہی ملیں شہرِ سایہ داراں میں
کسی نے چھاؤں نہ دی سائبان بھر کے مجھے

مشقتوں میں شراکت مجھے پسند نہیں
اکیلے ڈھونے ہیں پتھر مکان بھر کے مجھے

میں صرف اپنے قبیلے کی خیر کیوں مانگوں
کہ ایک جیسے ہیں انساں جہان بھر کے مجھے

غزل کہے تو سہی اس زمین میں انؔصر
کوئی دکھائے تو پتھر میں جان بھر کے مجھے

❀

ایسے نادان آدمی کچھ ہیں
جو یہ کہتے ہیں ''ہم سبھی کچھ ہیں''

میرے دیرینہ ہم نشینوں میں
آستینوں کے سانپ بھی کچھ ہیں

ہم گدایانِ عشق پیشہ میں
رنگ ہائے شہنشہی کچھ ہیں

تم کو راہوں کی دھول راس نہیں
اور ہم لوگ تو یہی کچھ ہیں

آپ کی غم گساریاں تو بجا
فکر و اندیشۂ خفی کچھ ہیں

ہم ہی کرتے نہیں عیاں انؔصر
ورنہ غم ہائے زندگی کچھ ہیں

❁

(نذرِفاروق)

آخری بار بغل گیر تھے ہم
اور پھر صورتِ تصویر تھے ہم

عجلتِ خواب نے مارا ورنہ
سیلِ ظلمات کی تاخیر تھے ہم

جب کوئی آنکھ اٹھی تیری طرف
صورتِ برّشِ شمشیر تھے ہم

تیرے سلجھائے سلجھ سکتے تھے
درخورِ ناخنِ تدبیر تھے ہم

توڑ کر پھینک دیا قسمت نے
ترکشِ وقت میں اک تیر تھے ہم

ظلم کو ظلم کہا کرتے تھے
اس لیے لائقِ تعزیر تھے ہم

آج مرجھا کے جہاں بکھرے ہیں
اسی گلزار کی تقدیر تھے ہم

دونوں اجڑے ہیں تو یاد آیا ہے
ایک ہی خواب کی تعبیر تھے ہم

حیف اُس گھر کا مقدر انؔصر
جس کی بنیاد پہ تعمیر تھے ہم

☆ سابق وزیرِ قانون محمد فاروق چوہدری شہید

❀

بے نور چراغوں کی گواہی میں جلیں گے
گُھل گُھل کے شبِ غم کی سیاہی میں جلیں گے

پلکیں بھی سلگ اٹھیں گی آنکھوں کی بھڑک سے
یہ دشت بھی شہروں کی تباہی میں جلیں گے

اے موجِ ہوا! ہم جہاں بجھتے ہیں وہیں پر
کچھ دیپ تری پشت پناہی میں جلیں گے

ہم بادۂ بے تاب کی صورت ہیں لبِ دوست!
ساغر میں نہ آئے تو صراحی میں جلیں گے

کیوں پوششِ گل مانگیے اربابِ چمن سے
جلنا ہے تو پھر اپنی قبا ہی میں جلیں گے

اے دشتِ بلا! آج بھی ہم قافلے والے
تنہا تری بے آب و گیاہی میں جلیں گے

فانوس کی حاجت نہیں خوددار دیوں کو
جب تک بھی جلے، تیز ہوا ہی میں جلیں گے

❀

ٹوٹ کر جیسے دریا سے پیاسے ملیں
یوں ملیں جب کسی آشنا سے ملیں

جس نے سرکش ہوا کی کمر توڑ دی
آیئے اُس دیے کی ضیا سے ملیں

عشق کی انتہا دیکھنی ہے تو آ
چل ذرا اہلِ کرب و بلا سے ملیں

سامنا تو کریں گفتگو ہو نہ ہو
آخری بار اس بے وفا سے ملیں

شہر کی تنگ گلیوں سے باہر چلیں
حبس کا جال توڑیں ہوا سے ملیں

عدل گاہیں نہیں ظلم گاہیں ہیں وہ
سائلوں کو جہاں بس دلاسے ملیں

کیا عجب ایسی گھڑیاں بھی آئیں کبھی
لوگ ہم سے ملیں ہم خدا سے ملیں

❀

غم عجب حال کیے جاتا ہے
لمحے کو سال کیے جاتا ہے

ورنہ مٹنے کے نہیں تھے ہم لوگ
وقت پامال کیے جاتا ہے

جس طرف جائے ہے وہ مست خرام
ایک بھونچال کیے جاتا ہے

پاؤں سے چھاؤں اُگاتا ہوا شخص
دھوپ پامال کیے جاتا ہے

قطرے قطرے کو ترسنے والا
ابر کو شال کیے جاتا ہے

مجھ سے جو کام نہیں ہو سکتے
میرا لجپال کیے جاتا ہے

❀

آج کل جس سے ملاقات بہت رہتی ہے
وہ مرے دھیان میں دن رات بہت رہتی ہے

جن دنوں تلخئ حالات بہت رہتی ہے
میرے ہونٹوں پہ تری بات بہت رہتی ہے

روشنی بن کے چلے آؤ تو احساں ہو گا
دل کی بستی ہے یہاں رات بہت رہتی ہے

آہیں تھمتی ہی نہیں اشک سنبھلتے ہی نہیں
آندھیاں چلتی ہیں برسات بہت رہتی ہے

چاہے سینے سے لگا چاہے ملا مٹی میں
اب مری جان ترے ہاتھ بہت رہتی ہے

یہ کسی گل کی رفاقت کا ثمر ہے شاید
ایک خوشبو سی مرے ساتھ بہت رہتی ہے

ہم چراغانِ وفا بامِ ہوس پر چپ چاپ
جل رہے ہیں کہ ابھی رات بہت رہتی ہے

❁

طوقِ مہ و سال توبہ توبہ
بچنے کا سوال توبہ توبہ
شہروں کے شہر اُجڑ گئے ہیں
ایسا بھونچال توبہ توبہ
جینا تو محال کب نہیں تھا
پر اتنا محال توبہ توبہ
قتلِ انسانیت پہ نازاں
شوقِ زر و مال توبہ توبہ

جس سمت بھی جایئے ہوس نے
پھیلائے ہیں جال توبہ توبہ
اُس رُخ کی کشش نہ پوچھ ہمدم
شعلے کا جمال توبہ توبہ
یاں کس کی مثال مل سکی ہے
پھر تیری مثال توبہ توبہ
اس شہرِ رئیس زادگاں میں
نادار کا حال توبہ توبہ
انگاروں بھری ڈگر عزیزو
گزرا ہوا سال توبہ توبہ
زلفوں کی سیہ گھٹائیں اس پر
یہ گال پہ خال توبہ توبہ
یہ ہجر نہیں ہے میرے بس کا
لے اس کو سنبھال توبہ توبہ

طیبہ و نجف کے بعد انؔصر
جنت کا خیال توبہ توبہ

❀

دوست جو سر پھری ہوا ہے مری
شاخ سے ٹوٹنا سزا ہے مری

حشر تک دربدر پھرے گی تُو
شامِ ہجراں یہ بددعا ہے مری

تیرے دم سے ہوں معتبر ورنہ
شہر میں آبرو ہی کیا ہے مری

ابتدا تھی کی جل رہا تھا میں
بجھ رہا ہوں یہ انتہا ہے مری

اس پہ قسمت نے پھول کاڑھے ہیں
یہ دریدہ بدن قبا ہے مری

سبھی رکھتے ہیں پیرہن پہ نظر
بے بسی کون دیکھتا ہے مری

ہر کوئی روند کر گزرتا ہے
بے خطا ہوں یہی خطا ہے مری

میں تجھے کیسے دور جانے دوں
تو تو اب جان بن گیا ہے مری

بہہ رہا ہوں کسی سفینے سا
موجِ سیلاب ناخدا ہے مری

روشنی کا خدا ہی حافظ ہے
جب شریکِ سفر ہوا ہے مری

پہلے دل کھینچتا تھا آپ کا حسن
اب رگِ جان کھینچتا ہے مری

طعنہ زن تھا جو میری صورت پر
آج تصویر پوجتا ہے مری

لڑتا جاتا ہوں اور سوچتا ہوں
خلق سے دشمنی ہی کیا ہے مری

❀

دل اشکوں کی روانی میں نہ رکھ دوں
اس انگارے کو پانی میں نہ رکھ دوں

کہیں رکھنا تو ہے اسبابِ ہستی
کسی کی پاسبانی میں نہ رکھ دوں

بھلا دوں حال بھی ماضی کی صورت
کہانی کو کہانی میں نہ رکھ دوں

تری چھاؤں سے نکلا ہوں تو خود کو
خود اپنی سائبانی میں نہ رکھ دوں

لہو باقی ہے کچھ اے چشمِ باراں
اسے تیری روانی میں نہ رکھ دوں

❀

خواہ بے ساز و رخت ہیں ہم لوگ
والئی تاج و تخت ہیں ہم لوگ

چھاؤں دیتے ہیں پھل لٹاتے ہیں
چلتے پھرتے درخت ہیں ہم لوگ

ٹوٹ جاتے ہیں ایک جھونکے سے
کون کہتا ہے سخت ہیں ہم لوگ

چھو گئے تھے کسی کلی سے کہیں
آج تک لخت لخت ہیں ہم لوگ

تہمتیں ہیں ہمارے لہجے پر
تم ہی کہہ دو کرخت ہیں ہم لوگ

اس زمانے میں اتنے اچھے دوست
کس قدر نیک بخت ہیں ہم لوگ

احتیاط، اے جہانِ تیشہ بدست!
کوہساروں سے سخت ہیں ہم لوگ

نہ اُتارو ہوا کے کاندھے سے
اس مسافر کا رخت ہیں ہم لوگ

❀

میں نے ڈالا جو عصا پانی میں
راستہ بنتا گیا پانی میں

بادباں کھلتے ہی طوفان اٹھا
چھپ کے بیٹھی تھی ہوا پانی میں

برف جیسا ہے لہو عشق بغیر
تھوڑی سی آگ ملا پانی میں

پھول شبنم کی جدائی میں مرا
اس کی میت کو بہا پانی میں

تو مرا ہے تو مری آنکھ میں رہ
گھر کی بنیاد اٹھا پانی میں

جھیل میں ایسا لگے چاند کا عکس
جیسے جلتا ہو دیا پانی میں

اتنی گھمبیر خموشی بھی کیا
کوئی کنکر ہی گرا پانی میں

❀

اپنی محرومیوں پہ رونا کیا
چھوڑیئے دل کا داغ دھونا کیا

قیس تُو نے خیالِ لیلیٰ کو
کر لیا اوڑھنا بچھونا کیا

کیا کہا آپ کا کہا مانیں
بن کے رہ جائیں ہم کھلونا کیا

حوصلہ چاہیئے محبت میں
کھیل ہے کشتیاں ڈبونا کیا

کیا بھلا سانحے رقم کرنا
انگلیاں خون میں ڈبونا کیا

اے بشر! تُو فنا کا پتلا ہے
پھر ترا ہونا کیا نہ ہونا کیا

آج خوش خوش دکھائی دیتے ہو
لگ گیا ہاتھ ایسا سونا کیا

❀

کسی پہ واری ہوئی زندگی پہ کیا رونا
جوئے میں ہاری ہوئی زندگی پہ کیا رونا

قبائے زیست میں پیوندِ غم غنیمت ہے
سجی سنواری ہوئی زندگی پہ کیا رونا

بسر کیے ہوئے لمحات کا ملال نہ کر
کہ اب گزاری ہوئی زندگی پہ کیا رونا

یہ رائیگانی کوئی رائیگانی تھوڑی ہے
خدا کو پیاری ہوئی زندگی پہ کیا رونا

لٹا نہ اشک دلِ داغدار توبہ کر
ہوس کی ماری ہوئی زندگی پہ کیا رونا

جدائیوں کی اذیت پہ خاک ڈال میاں
لحد اتاری ہوئی زندگی پہ کیا رونا

یہ بوجھ اُتار کے ہم نے تو سُکھ کا سانس لیا
بدن پہ بھاری ہوئی زندگی پہ کیا رونا

❀

زمیں کے دامنِ صد چاک سے نکل جائیں
چلو ستارہ بنیں، خاک سے نکل جائیں

رہیں سمٹ کے تو یک ذرہ بیش تر ہے ہمیں
کھلیں تو وسعتِ افلاک سے نکل جائیں

عجب نہیں کسی دن دستِ کوزہ گر سے ہم
پھسل کے ایسے گریں چاک سے نکل جائیں

ہماری غیرتِ ایمان کا تقاضا ہے
انا کے بل پہ تری دھاک سے نکل جائیں

جو اس زمین کا کھائیں اسی کو گالی دیں
وہ کم نسب وطنِ پاک سے نکل جائیں

❀

تُو آ کے چلی جائے تو آرام نہ آئے
اے صبحِ ملاقات! تری شام نہ آئے

آئے تو کہیں جانے کا لیتا ہی نہیں نام
جائے تو کوئی نامہ و پیغام نہ آئے

اس ڈر سے کسی پھول کو چھو کر نہیں دیکھا
پاکیزگئ حسن پہ الزام نہ آئے

ہر برگِ گلابی میں جھلکتا ہے مرا خوں
کیوں تذکرۂ گل میں مرا نام نہ آئے

دعویٰ تھا جنہیں جان چھڑکنے کا وہی لوگ
لمحاتِ مصیبت میں مرے کام نہ آئے

❀

جب سرِ راہ ترا نقشِ قدم کھنچتا ہے
دل بڑی دیر تلک بارِ الم کھنچتا ہے

وہ جو آسودہ ہیں اُن کو بھی شکایت ہے کہ تُو
پیشِ دامانِ طلب دستِ کرم کھنچتا ہے

ایک سے ایک حسیں شہر میں موجود سہی
آپ کے سامنے کوئی نہیں دم کھنچتا ہے

آہیں رُکتی ہیں نہ اشکوں کی لڑی ٹوٹتی ہے
کون یوں شعلہ و شبنم کو بہم کھنچتا ہے

جانے کس موج میں گم ہے دلِ آشفتہ مزاج
تجھ کو پا کر بھی ترے ہجر کا سم کھینچتا ہے

دیکھئے کشمکشِ دیدہ و دل کیا دکھلائے
اِسے کعبہ تو اُسے شوقِ صنم کھینچتا ہے

روک رکھا ہے ترے قرب کے احساس نے بھی
اور کچھ شہر کا موسم بھی قدم کھینچتا ہے

یاد ہے چشمِ گریزاں کا جھپکنا انؔصر
جس طرح کوئی ہرن دشت میں رم کھینچتا ہے

❀

ناگواری سہی اظہار سلیقے سے کر
کارِ نفرت بھی مرے یار سلیقے سے کر

پہلے تو گھر کی ہر اک چیز کو انصاف سے بانٹ
اور پھر صحن میں دیوار سلیقے سے کر

آنکھ سے آنکھ ملا ہونٹ نہیں ہلنے دے
عشق ہو جائے تو اظہار سلیقے سے کر

پل کی غفلت میں خسارہ ہے کئی صدیوں کا
زندگی سانس کا بیوپار سلیقے سے کر

میں کہیں بچ ہی نہ جاؤں تری کوتاہی سے
دیکھ اے دشمنِ جاں وار! سلیقے سے کر

چپکے چپکے سے نظر ڈال دلِ نازک پر
اس پرندے کو گرفتار سلیقے سے کر

بھید کھلنے پہ ترا تخت نہ چھن جائے کہیں
خلق کو برسرِ پیکار سلیقے سے کر

❀

اب تو ہر آنکھ کشیدہ ہے کمانوں کی طرح
شہر کا شہر ہے دشمن کی مچانوں کی طرح

ہم چٹانوں کی طرح تھے تو گماں تک بھی نہ تھا
بیٹھ جائیں گے کبھی کچے مکانوں کی طرح

ایک اک کر کے رفاقت کی لڑی سے نکلے
یار ٹوٹی ہوئی تسبیح کے دانوں کی طرح

زندگی اتنی بھیانک بھی نہیں جانِ من!
تیرے وہموں کی طرح میرے گمانوں کی طرح

اُن چمکتی ہوئی آنکھوں کو ذرا غور سے دیکھ
حیرتیں دیتے ہوئے آئینہ خانوں کی طرح

ہائے وہ سوکھے ہوئے پیڑ، وہ پت جھڑ کی ہوا
بین کرتے ہوئے مظلوم گھرانوں کی طرح

یا ہمیں حاضر و موجود سمجھ کر مانو
یا فراموش کرو گزرے زمانوں کی طرح

غیر کی شہ پہ ہمیں ہاتھ سے کھونے والے
ڈھونڈتے پھرتے ہیں گم گشتہ خزانوں کی طرح

میرا سینہ ہے کہ گنبد ہے کسی مسجد کا
دھڑکنیں گونجتی رہتی ہیں اذانوں کی طرح

عرض کیا کیجئے احوالِ تمنا انؔصر
اب تو کانوں پہ بھی تالے ہیں زبانوں کی طرح

❁

جب بھی دیتے ہیں سنائی کسی مظلوم کے بین
تڑپ اٹھتا ہے وہیں پر مرے اندر کا حسین

میرے کردار پہ جو حرف زنی کرتے تھے
لیے پھرتے ہیں سروں پر مری خاکِ نعلین

آن پہنچی ہے بلاوے کی گھڑی جاگ اٹھو
پھر بپا ہونے کو ہے معرکۂ بدر و حنین

مان لیتے ہیں کہ تم ہم سے بچھڑ کر خوش ہو
ورنہ کچھ اور ہی کہتے ہیں یہ بھیگے ہوئے نین

دل نہیں جان کا نذرانہ طلب کر ہم سے
کچھ نہ کچھ فرق تو ہو عشق و ہوس کے مابین

سرکشیدہ ہوں یزیدوں کے مقابل انصؔر
مجھ کو جھکنے نہیں دیتا مرے اندر کا حسین

❀

بجھی بجھی ہے طبیعت، انا شکستہ ہے
صنم کدہ مرے پندار کا شکستہ ہے

زمیں پہ جھکتے ہوئے جسم سے کُھلا ہم پر
کہ یہ مکان سراسر بِنا شکستہ ہے

میں ٹوٹ پھوٹ کے یکجا ہوں حوصلہ مرا دیکھ
جہان میں کوئی مجھ سا بتا شکستہ ہے؟

ملا ہے غم تو اٹھانے کا حوصلہ بھی نہیں
ہوئی ہے شام تو گھر کا دیا شکستہ ہے

لگی تھی چوٹ کہیں سنگِ نامرادی سے
سو ایک عمر سے دستِ دعا شکستہ ہے

کہاں بساؤں تجھے آرزوئے یار بتا
یہ دل شکستہ ہے شہرِ وفا شکستہ ہے

سسک رہی ہے سرِ شام کوئی کیا جانے
دمِ چراغ سے موجِ ہوا شکستہ ہے

غبارِ آتش و آہن کہیں تھمے تو کھلے
یہاں پہ کون سلامت ہے کیا شکستہ ہے

❀

ہوا کے قافلے جو چلتے چلتے رُک گئے ہیں
پرندے گھونسلوں میں ڈر کے مارے رُک گئے ہیں

کسی زنجیرِ نادیدہ کے کھینچے چل رہے تھے
کسی دیوارِ ناپیدا کے روکے رُک گئے ہیں

محاذِ جنگ سے پسپا ہوا لشکر کا لشکر
مگر ہم ہیں کہ اپنے حوصلے سے رُک گئے ہیں

ارے ہم خار و خس کیا ہیں تری رفتار آگے
ترے چلنے سے دریاؤں کے دھارے رُک گئے ہیں

کہا معدوم ہیں رستے محبت کے، وہ بولے
نہیں، ایسا نہیں ہے، چلنے والے رُک گئے ہیں

اندھیرے چھٹ گئے آخر، سویرا ہو گیا ناں
کسی کے روکنے سے کیا اُجالے رُک گئے ہیں

❀

ہر آج سے کل نکالتا ہوں
تنہائی کا حل نکالتا ہوں

دم کھینچ کے جسم کے کنویں سے
بیتے ہوئے پل نکالتا ہوں

درویش ہوں اور دعائیں کر کے
تقدیر کے بل نکالتا ہوں

پہلے کرتا ہوں فکر ایجاد
پھر راہِ عمل نکالتا ہوں

اے خارِ نفس! ذرا ٹھہر جا
تیرا کوئی حل نکالتا ہوں

میں سینۂ آتشیں سے ہر شب
سورج کا بدل نکالتا ہوں

لاتا ہوں سخن کی شاخ پر پھول
پھر پھول سے پھل نکالتا ہوں

دو چار مہینوں بعد انؔصر
ایک آدھ غزل نکالتا ہوں

❀

گاہ دیوار کبھی در کی طرف دیکھتے ہیں
کتنی حسرت سے ترے گھر کی طرف دیکھتے ہیں

کنجِ تنہائی میں جب حبسِ نظر بڑھ جائے
کھڑکیاں کھول کے باہر کی طرف دیکھتے ہیں

کج کلاہانِ ستم کیش ذرا ہوش کہ یاں
لوگ دستار نہیں سر کی طرف دیکھتے ہیں

نارسائی میں بھی ہے شوقِ رسائی کیا کیا
یعنی صحرا سے سمندر کی طرف دیکھتے ہیں

پستئ فکر و سخن تنگِ ریاضت ہے میاں
ہم تو بہتر سے بھی بہتر کی طرف دیکھتے ہیں

بے خد و خال سے رکھے ہیں کسی کونے میں
سنگِ بت خانہ ہیں آزر کی طرف دیکھتے ہیں

جانے والے تری تصویر ہتھیلی پہ لیے
دیر تک خطِ مقدر کی طرف دیکھتے ہیں

آج بھی معرکئہ کرب و بلا میں کچھ لوگ
تشنہ لب ہوں تو بہتر کی طرف دیکھتے ہیں

کوئی الجھن ہے کہ سلجھائے، سلجھتی ہی نہیں
مدتوں سے ترے پیکر کی طرف دیکھتے ہیں

ایک بے رحم سے امیدِ کرم ہے انؔصر
کتنے ایمان سے پتھر کی طرف دیکھتے ہیں

❀

درد کی لَے پہ جو ملہار چھڑا کرتی ہے
زندگی تیرے تغافل کا گلہ کرتی ہے

دل دھڑکتا ہے کہ جاں کھنچتی ہے معلوم نہیں
کوئی آواز مجھے خود سے جدا کرتی ہے

بھیگنے والے کو اس بات کا احساس کہاں
ایسی برسات مقدر سے ملا کرتی ہے

تلخئ گردشِ دوراں میں ترا یاد آنا
جیسے ٹھنڈک میں کڑی دھوپ مزہ کرتی ہے

لوحِ محفوظ پہ لکھا ہے مری لَو کا دوام
خود ہوا بھی مرے جلنے کی دعا کرتی ہے

ہم سے کیا پوچھتا ہے ہم تجھے کیا بتلائیں
تجھ کو معلوم ہے دُنیا تری کیا کرتی ہے

ہم فقیروں کی نظر سے نہ ڈرا کر انصؔر
یہ نظر وہ ہے کہ سوکھے کو ہرا کرتی ہے

❀

جہاں اک عمر کھوئی تھی وہیں کا بھی نہیں رکھا
ہمیں اس کارِ دنیا نے کہیں کا بھی نہیں رکھا

اُٹھایا آستاں سے یوں کہ سجدے منہ پہ دے مارے
لو اس نے تو بھرم داغِ جبیں کا بھی نہیں رکھا

نکالا وہم سینے سے کہ یہ دشمن وفا کا تھا
سو اس زہری کو اب کے آستیں کا بھی نہیں رکھا

ہوس نے خوب روندا ہے وقارِ آدمیت کو
فلک سے تو اُتارا تھا زمیں کا بھی نہیں رکھا

بنامِ دوستی چپ چاپ لٹتا آ رہا ہوں میں
مجھے تو اس مروّت نے کہیں کا بھی نہیں رکھا

وہ خود ٹوٹے تو رونے کا سلیقہ بھول کر روئے
خیال اس بار چشمِ سرمگیں کا بھی نہیں رکھا

انا کی موج میں اُٹھے تو منزل سے گزر آئے
ذرا سا شک نگاہِ واپسیں کا بھی نہیں رکھا

❀

دیکھ اے چشمِ حسیں! اے سخنستاں! قرباں
ایک غمزے پہ ترے میرؔ کا دیواں قرباں

دل نے پہلی ہی نظر میں یہ گواہی دے دی
ایسے کافر پہ کیا جاتا ہے ایماں قرباں

زُلفِ جاناں تری آورگئی پیہم پر
مصحفِ زیست کے اوراقِ پریشاں قرباں

قیس کے یار ہیں سو ہم سے نہیں ہو سکتی
عزتِ شہر پہ ناموسِ بیاباں قرباں

سونا چاندی تو کجا تیری مہذب دنیا
سنگ ریزوں پہ بھی کر دیتی ہے انساں قرباں

❀

دل کے رستے میں اک ایسی بھی ڈگر آتی ہے
پاؤں رُکتے ہیں نہ منزل کی خبر آتی ہے

بڑھ کے سینے سے لگاؤ کہ تھکی ہاری شام
ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے اِدھر آتی ہے

شہر خالی ہوا جاتا ہے شناساؤں سے
روز دو چار کے مرنے کی خبر آتی ہے

پیار کی لَو کسی دروازے کی محتاج نہیں
یہ تو دیوار کی درزوں سے گزر آتی ہے

آنے والا ہے کوئی لشکرِ جرّار یہاں
دُھول اُڑتی ہوئی ہر سمت نظر آتی ہے

❀

وہ شعلہ گیر ہوائیں، وہ بادباں پہ چراغ
عذاب بن کے گرے کشتیٔ رواں پہ چراغ

کوئی نہ کوئی تو رہتا ہے اس خرابے میں
کہ شام ہوتے ہی جلتے ہیں آسماں پہ چراغ

وہاں وہاں سے اٹھائے گا سر نیا سورج
ہوا شہید کرے گی جہاں جہاں پہ چراغ

جہاں بھٹکنے لگا قافلہ زمانے کا
دمک اٹھے ترے قدموں کے ہر نشاں پہ چراغ

بس ایک آخری احساں بس ایک آخری پھونک
کہ راہ دیکھ رہا ہے فصیلِ جاں پہ چراغ

میں روشنی کا تسلسل ہوں میرا نام نہ پوچھ
کبھی فلک پہ ستارہ کبھی سناں پہ چراغ

سلگ رہے ہیں سفینوں سمیت پانی میں
سجا سجا کے جو رکھتے تھے، بادباں پہ چراغ

تمام شب تو اندھیرے میں کاٹ دی انؔصر
جلانے بیٹھ گئے صبح کی اذاں پہ چراغ

❁

اس تکلم کی ادا پر کوئی کیا بات کرے
ہونٹ چپ ہوں تو ترا رنگِ حنا بات کرے

دیکھ ہم خاک نشینوں سے زمانے کا سلوک
جیسے سوکھے ہوئے پتوں سے ہوا بات کرے

مجھ کو ہر فیصلہ منظور مگر آخری بار
وہ مرے سامنے آ کر تو ذرا بات کرے

ایک پتھرائی ہوئی بھیڑ سے ہوں محوِ کلام
جیسے خاموش مزاروں سے دیا بات کرے

سارے عالم سے جدا ہو ترا اعجازِ سخن
جس سے تُو بات کرے اُس سے خدا بات کرے

❀

کبھی کبھار ملاقات کا بہانہ بنے
پھر اس کے بعد بلا سے کوئی فسانہ بنے

عجب نہیں ہے کہ اس بار دو اناؤں کی جنگ
جہان بھر کی تباہی کا شاخسانہ بنے

وہ سب جہان کا ہے سب جہان اس کا ہے
بس ایک میرے لیے اس کے دل میں جا نہ بنے

ہزار شکر کہ ہم پر گُلوں کی بارش ہے
مگر وہ لوگ جو بارود کا نشانہ بنے

حسینیت کی کرامات کا ظہور کہاں
کہ جب تلک کوئی جنگاہ کربلا نہ بنے

❁

یہیں سے لوٹ چلو واسطہ خدا کا ہے
کہ اب انا کا نہیں مسئلہ بقا کا ہے

ترے چراغ کا بجھنا انوکھی بات نہیں
بہت دنوں سے یہی مشغلہ ہوا کا ہے

یہ اور بات کہ چپ ہیں مروّتاً ورنہ
گلہ ہمیں بھی سخن ہائے ناسزا کا ہے

سلام کرتا ہے ہر کوئی چڑھتے سورج کو
برا نہ مان کہ یہ دور ہی ریا کا ہے

مرے سخن کی پذیرائی میرے فن کا جمال
یہ معجزہ کسی درویش کی دعا کا ہے

یہ بات ننھے شگوفوں سے کیوں چھپائی گئی
کہ ہاتھ پھول کی رسوائی میں صبا کا ہے

تمہارا زعمِ محبت بجا سہی انؔصر
مگر وہ شخص بھی مغرور انتہا کا ہے

❀

آؤ کہ بہل جائیں گھڑی دو گھڑی آنکھیں
پتھرا ہی نہ جائیں کہیں در پر لگی آنکھیں

اک سلسلۂ خواب ہے یہ عالمِ موجود
مر جائے تو کُھل جاتی ہیں انسان کی آنکھیں

پلکوں پہ نمی لے کے گھروں سے نہ نکلنا
دُنیا کو بُری لگتی ہیں، روتی ہوئی آنکھیں

خیرات میں بخشی ہوئی صبحیں نہیں لوں گا
کافی ہیں مجھے رات، دیا، روشنی، آنکھیں

اک طرفہ مصیبت ہے لگاتار خموشی
اور اس پہ قیامت ہیں تری بولتی آنکھیں

افلاک پہ انتصر یہ ستاروں کا دمکنا
ہوں جیسے منڈیروں پہ جلا کر دھری آنکھیں

❀

بکھر چکا ہوں کوئی تو سمیٹنے آئے
جو آئے وہ بھی تماشا ہی دیکھنے آئے

تم اپنی آنکھ کی گہرائی کو نہ دو الزام
ہم آپ چل کے سمندر میں ڈوبنے آئے

رُکے تو پاؤں تلے سے زمیں سرکنے لگی
چلے تو کتنے ہی طوفان روکنے آئے

مصالحت کے بہانے کئی چھپے دشمن
نئی لڑائی کی بنیاد ڈالنے آئے

غیور لوگ تھے جب بھوک سے نڈھال ہوئے
تو گھر کا قیمتی سامان بیچنے آئے

سہارا لے کے پرانی رفاقتوں کا سدا
مرے عزیز مرا خون چوسنے آئے

اُکھڑ چلے ہیں پہاڑوں کے بھی قدم اب تو
کوئی تو کانپتی دھرتی کو تھامنے آئے

دیگر تصنیفات

دسترس	(مجموعہ غزل)	
تازِیانہ	(مجموعہ غزل)	زیرِ طبع